یہ قرآن کی سب سے پہلی سورت ہے۔ اس لئے فاتحۃ الکتاب کے نام سے پکاری جاتی ہے۔

با قرآن کی سب سے پہلی سورت ہے۔ اس لئے فاتحۃ الکتاب کے نام سے پکاری جاتی ہے۔

با قرآن کی سب سے پہلی سورت ہے۔ اس لئے فاتحۃ الکتاب کے نام سے پکاری جاتی ہے۔

باقرآن کی سب سے پہلی سورت ہے۔اس لئے فاتحۃ الکتاب کے نام سے پکاری جاتی ہے۔

باقرآن کی سب سے پہلی سورت ہے۔ اس لئے فاتحۃ الکتاب کے نام سے پکاری جاتی ب

با قرآن کی سب سے پہلی سورت ہے۔اس لئے فاتحۃ الکتاب کے نام سے پکاری جاتی ہے۔

با قرآن کی سب سے پہلی سورت ہے۔اس لئے فاتحۃ الکتاب کے نام سے پکاری جاتی ہے۔

باقرآن کی سب سے پہلی سورت ہے۔اس لئے فاتحۃ الکتاب کے نام سے پکاری جاتی ہے۔

جو بات زیادہ اہم ہوتی ہے، قدرتی طور پر پہلی اور نمایاں جگہ پاتی ہے۔ یہ سورت قرآن کی تمام سورتوں میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس لئے قدرتی طور پر اس کی موزوں جگہ قرآن کے پہلے صفحے ہی میں قرار پائی، چنانچہ خود قرآن نے اس کا ذکر ایسے لفظوں میں کیا ہے جس سے اس کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

(وَلَقَدۡ اٰتَیۡنٰکَ سَبۡعًا مِّنَ الۡمَثَانِیۡ وَ الۡقُرۡاٰنَ الۡعَظِیۡمَ ﴿۸۷﴾ ۱۵۔ الحجر : ۸۷)

اور (اے پیغمبر) ہم نے تمہیں سات آیات دی ہیں جو (نماز میں) دہرائی جاتی ہیں اور قرآن عظیم (عطا کیا ہے)۔

احادیث و آثار سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اس آیت میں ''دہرائی جانے والی آیات'' سے مقصود یہی سورت ہے، کیونکہ یہ سات آیات کا مجموعہ ہے اور ہمیشہ نماز میں دہرائی جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اس سورت کو ''سبع المثانی'' بھی کہتے ہیں علاوہ بریں ایک سے زیادہ حدیثیں موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سورت کے یہ اوصاف عہد نبوت میں عام طور پر مشہور تھے۔ ایک حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ نے ابی بن کعبؓ کو یہ سورت پڑھنے کی تلقین کی اور فرمایا کہ اس کے مثل کوئی سورت نہیں۔

سورۃ فاتحہ میں دین حق کے تمام مقاصد کا خلاصہ موجود ہے، چنانچہ اس سورت کے مطالب پر نظر ڈالتے ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس میں اور قرآن کے بقیہ حصہ میں اجمال اور تفصیل کا سا تعلق پیدا ہو گیا ہے یعنی قرآن کی تمام سورتوں میں دین حق کے جو مقاصد بہ تفصیل بیان کئے گئے ہیں، سورۃ فاتحہ میں انہی کا بہ شکل اجمال بیان موجود ہے۔ اگر ایک شخص قرآن میں سے اور کچھ نہ پڑھ سکے، صرف اس سورت کے مطالب ذہن نشین کر لے تب بھی وہ دین حق اور توحید پرستی کے بنیادی مقاصد معلوم کر لے گا اور یہی قرآن کی تمام تفصیلات کا ما حصل ہے۔

علاوہ بریں جب اس پہلو پر غور کیا جائے کہ سورت کا پیرایہ دعائیہ ہے اور اسے روزانہ عبادت کا ایک لازمی جز قرار دیا گیا ہے، تو اس کی یہ خصوصیت اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے، اور واضح ہو جاتا ہے کہ اس اجمال و تفصیل میں بہت بڑی مصلحت پوشیدہ تھی۔ مقصود یہ تھا کہ قرآن کے مفصل بیانات کا ایک مختصر و سیدھا سادہ خلاصہ بھی ہو جسے ہر انسان بہ آسانی ذہن نشین کر لے، اور پھر ہمیشہ اپنی دعاؤں اور عبادتوں میں دہراتا رہے۔ یہ اس کی دینی زندگی کا دستور العمل، توحید پرستی کے عقائد کا خلاصہ اور روحانی تصورات کا نصب العین ہوگا۔

یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ دنیا میں جو چیز جتنی زیادہ حقیقت کے قریب ہوتی ہے، اتنی ہی زیادہ سہل اور دلنشین بھی، اور خود فطرت کا یہ حال ہے کہ کسی گوشے میں بھی الجھی ہوئی نہیں ہے۔ الجھاؤ جس قدر بھی پیدا ہوتا ہے، بناوٹ اور تکلف سے پیدا ہوتا ہے، پس جو بات سچی اور حقیقی ہوگی، ضروری ہے کہ سیدھی سادی اور دلنشین ہو، دل نشینی کی انتہا یہ ہے کہ جب کبھی کوئی ایسی بات آپ کے سامنے آجائے تو ذہن کو کسی طرح اجنبیت محسوس نہ ہو، وہ اسی طرح سے قبول کرے گویا پیشتر سے سمجھی، بوجھی ہوئی بات تھی۔

اب غور کریں کہ جہاں تک انسان کا تصور توحید پرستی کا تعلق ہے، اس سے زیادہ سیدھی سادی باتیں اور کیا ہو سکتی ہیں جو اس سورت میں بیان کی گئی ہیں، اور پھر اس سے زیادہ سہل اور دلنشین اسلوب بیان کیا ہو سکتا ہے؟ سات چھوٹے چھوٹے جملے ہیں۔ ہر جملہ چار پانچ لفظوں سے زیادہ کا نہیں، اور ہر لفظ صاف اور دلنشین معانی کا نگینہ ہے جو اس انگوٹھی میں جڑ دیا گیا ہے۔ اللہ کو مخاطب کر کے ان صفتوں سے پکارا گیا ہے جن کا جلوہ شب و روز انسان کے مشاہدے میں آتا رہتا ہے۔ اگرچہ وہ اپنی جہالت و غفلت سے ان میں غور و تفکر نہیں کرتا۔ پھر اس کی بندگی کا اقرار ہے، اس کی مددگاریوں کا اعتراف ہے، اور زندگی کی لغزشوں سے بچ کر سیدھی راہ پر چلنے کی طلبگاری ہے۔ کوئی مشکل خیال نہیں، کوئی انوکھی بات نہیں، کوئی عجیب و غریب راز نہیں۔ جب کہ ہم بار بار یہ سورت پڑھتے رہتے ہیں اور صدیوں سے اس کے مطالب نوع انسانی کے سامنے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ہمارے دینی تصورات کی ایک بہت ہی معمولی سی بات ہے لیکن یہی معمولی بات جس وقت تک دنیا کے سامنے نہیں آئی تھی، اس سے زیادہ کوئی غیر معلوم اور ناقابل حل بات بھی نہ تھی۔ دنیا میں حقیقت اور سچائی کی ہر بات کا یہی حال ہے، جب تک سامنے نہیں آتی معلوم ہوتا ہے، اس سے زیادہ مشکل بات کوئی نہیں۔ جب سامنے آجاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے، اس سے زیادہ صاف اور سہل بات اور کیا ہو سکتی ہے۔

دنیا میں جب کبھی وحی الٰہی کی ہدایت نمودار ہوئی ہے، اس نے یہ نہیں کیا ہے کہ انسان کو نئی نئی باتیں سکھا دی ہوں، کیونکہ توحید پرستی کے بارے میں کوئی انوکھی بات سکھائی ہی نہیں جا سکتی۔ اس کا کام صرف یہ رہا ہے کہ انسان کے وجدانی عقائد کو علم و اعتراف کی ٹھیک ٹھیک تعبیر بتا دے اور یہی سورۃ فاتحہ کی خصوصیت ہے۔

اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان ہمیشہ رحم کرنے والا ہے۔ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں جو تمام جہانوں کا رب ۲ ہے۔ رحمن (اور) رحیم ہے ۳ روز جزا کا مالک ۵، ۴ ہے۔ (اے اللہ) ہم تیری ہی ۶ عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں ہمیں سیدھی راہ چلا ۷ ان لوگوں کی راہ جن پر تو نے انعام فرمایا ۸۔ نہ ان کی جن پر (تیرا) غضب (نازل) ہوا ۱۹ور نہ گمراہوں کی۔ ۷ ع ۱

۱۔ تعریف کسی کی بھی ہو، کسی نام سے بھی ہو درحقیقت صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہوتی ہے اور اسی کو پہنچتی ہے۔ حاکم اگر عادل ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ نے صفت عدل اس کے اندر رکھ دی ہے۔ کسی کی شکل خوبصورت ہے اور کسی کی سیرت پاکیزہ ہے تو تعریف و ستائش کی اصل مستحق ذات باری تعالیٰ ہے۔

اللہ کے تصور کے بارے میں انسان کی ایک بڑی غلطی یہ رہی ہے کہ وہ اس تصور کو محبت کی جگہ خوف و دہشت کی چیز بنا لیتا تھا سورۃ فاتحہ کے سب سے پہلے لفظ نے اس گمراہی کا ازالہ کر دیا۔ اس کی ابتدا حمد کے اعتراف سے ہوتی ہے۔ حمد ثنائے جمیل کو کہتے ہیں یعنی اچھی صفتوں کی تعریف کرنے کو۔ ثناء جمیل اسی کی کی جا سکتی ہے جس میں خوبی و جمال ہو۔ پس حمد کے ساتھ خوف و دہشت کا تصور جمع نہیں ہو سکتا۔ جو ذات محمود ہوگی، وہ خوفناک نہیں ہو سکتی۔ پھر حمد کے بعد اللہ کی عالمگیر ربوبیت، رحمت اور عدالت کا ذکر کیا ہے، اور اس طرح صفات الٰہی کی ایک ایسی مکمل شبیہ کھینچ دی ہے جو انسان کو وہ سب کچھ دے دیتی ہے جس کی انسانیت کے نشوو ارتقا کے لئے ضرورت ہے اور ان تمام گمراہیوں سے محفوظ کر دیتی ہے جو اس راہ میں اسے پیش آسکتی ہیں۔

۲۔ 'رب' کا لفظ عربی زبان میں تین معنوں میں بولا جاتا ہے: (۱) مالک اور آقا۔ (۲) پرورش اور خبر گیری کرنے والا۔ (۳) فرمانروا اور حاکم۔ اللہ تعالیٰ ان سب معنوں میں کائنات کا رب ہے۔

رب العالمین میں اللہ کی عالمگیر ربوبیت کا اعتراف ہے جو ہر فرد، ہر جماعت، ہر قوم، ہر ملک، ہر گوشہ

اور ہر وجود کے لئے ہے، اور اس لئے یہ اعتراف ان تمام تنگ نظریوں کا خاتمہ کر دیتا ہے جو دنیا کی مختلف قوموں اور نسلوں میں پیدا ہو گئی تھیں، اور ہر قوم اپنی جگہ سمجھنے لگی تھی کہ اللہ کی برکتیں اور سعادتیں صرف اسی کے لئے ہیں، کسی دوسری قوم کا ان میں حصہ نہیں۔

۳۔ رحمن مبالغہ کا صیغہ ہے اور رحیم صفت کا۔ رحمن اللہ کی رحمت کے جوش و خروش کو ظاہر کرتا ہے اور رحیم اس کے دوام و تسلسل کو، اللہ کی رحمت میں صرف جوش ہی نہیں ہے بلکہ پائداری اور استقلال بھی ہے۔ اس نے یہ نہیں کیا ہے کہ اپنی رحمانیت کے جوش میں دنیا تو پیدا کر دی اور پھر پیدا کر کے اس کی خبرگیری اور نگہداشت سے غافل ہو گیا ہو بلکہ اس کو پیدا کر کے وہ اپنی پوری شان رحیمیت کے ساتھ اس کی پرورش اور نگہداشت بھی فرما رہا ہے۔ پھر اس کی رحمتیں اس چند روزہ زندگی تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ جو لوگ اس کے بتائے ہوئے رستے پر چلتے رہیں گے ان پر اس کی رحمت ایک ایسی لازوال اور ابدی زندگی میں بھی ہو گی جو کبھی ختم ہونے والی نہیں۔

۴۔ ''الدِّینِ'' کا لفظ جزا کے قانون کا اعتراف ہے اور جزا کو 'دین' کے لفظ سے تعبیر کر کے یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ جزا انسانی اعمال کے قدرتی نتائج و خواص ہیں، یہ بات نہیں کہ اللہ کا غضب و انتقام بندوں کو عذاب دینا چاہتا ہو کیونکہ 'الدِّین' کے معنی بدلہ اور مکافات کے ہیں۔

۵۔ یعنی اس دن کا مالک جب تمام انسانوں کو جمع کر کے ان کے کارنامہ زندگی کا حساب لیا جائے گا اور ہر شخص کو اس کے عمل کا پورا صلہ اور بدلہ مل جائے گا۔ مالک وہ ہوتا ہے جسے پورے اختیارات حاصل ہوں۔ مجرم کو چاہے تو بخش دے چاہے تو سزا دے۔ کوئی اس سے باز پرس کرنے والا نہیں اور کوئی اس پر حاکم نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی تعریف میں رحمن اور رحیم کہنے کے بعد روز جزا کا مالک کہنے سے یہ بات نکلتی ہے کہ وہ صرف مہربان ہی نہیں بلکہ منصف بھی ہے۔

'ربوبیت' اور 'رحمت' کے بعد مٰلِکِ یَوْمِ الدِّینِ کے وصف نے یہ حقیقت بھی آشکارا کر دی کہ اگر کائنات میں صفات رحمت و جمال کے ساتھ قہر و جلال بھی اپنی نمود رکھتی ہیں تو یہ اس لئے نہیں کہ پروردگار عالم میں غضب و انتقام ہے، بلکہ اس لئے کہ وہ عادل ہے، اور اس کی حکمت نے ہر چیز کے لئے اس کا ایک خاصہ اور نتیجہ مقرر کر دیا ہے۔ عدل منافی رحمت نہیں ہے بلکہ عین رحمت ہے۔

۶۔ یعنی ہم تجھ ہی کو حاجت روا سمجھ کر تیری طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس آیت نے ہر قسم کی مظہر پرستی اور مخلوق پرستی کی جڑ کاٹ دی ہے اور خفیف سی گنجائش بھی پیر پرستی، پیغمبر پرستی، فرشتہ پرستی یا اولیاء پرستی کی باقی نہیں چھوڑی ہے۔

عبادت کے لئے یہ نہیں کہا کہ 'نَعْبُدُکَ' بلکہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ یعنی یہ نہیں کہ 'تیری عبادت کرتے ہیں' بلکہ حصر کے ساتھ کہا 'صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں'۔ اس اسلوب بیان نے توحید کے تمام مقاصد پورے کر دیئے، اور شرک کی ساری راہیں بند ہو گئیں۔

۷۔ یعنی وہ راہ جس میں کوئی کجی نہیں، کوئی اونچ نیچ نہیں، کہیں ٹھوکر لگنے کا احتمال نہیں۔ اس سے مراد جادہ شریعت ہے کہ یہی زندگی کا مکمل نظام ہے۔

سعادت و فلاح کی راہ کو 'صراط المستقیم' یعنی سیدھی راہ سے تعبیر کیا جس سے زیادہ بہتر اور قدرتی تعبیر نہیں ہو سکتی، کیونکہ کوئی نہیں جو سیدھی راہ اور ٹیڑھی راہ میں امتیاز نہ رکھتا ہو اور پہلی راہ کا خواہشمند نہ ہو۔

۸۔ پھر اس کے لئے ایک ایسی سیدھی سادی اور جانی بوجھی ہوئی شناخت بتا دی جس کا یقین قدرتی طور پر ہر انسان کے اندر موجود ہے یعنی وہ راہ جو انعام یافتہ انسانوں کی راہ ہے۔ خواہ کوئی ملک، کوئی قوم، کوئی زمانہ، کوئی فرد ہو لیکن انسان ہمیشہ دیکھتا ہے کہ زندگی کی دو راہیں یہاں صاف موجود ہیں۔ ایک راہ کامیاب انسانوں کی راہ ہے، ایک ناکام انسانوں کی، پس ایک واضح اور آشکارا بات کیلئے سب سے بہتر علامت یہی ہو سکتی ہے کہ اس کی طرف انگلی اٹھا دی جائے۔ اس سے زیادہ کچھ کہنا، ایک معلوم بات کو مجہول بنا دینا تھا۔ انعام سے مراد دینی انعام ہے۔ انعام پانے والے چار گروہ ہیں، انبیاء، شہداء، صدیقین اور صالحین جیسا کہ سورۃ النساء کی آیت ۶۹ سے واضح ہے۔

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس سورت کیلئے دعا کا پیرایہ اختیار کیا گیا ہے، کیونکہ اگر تعلیم و امر کا پیرایہ اختیار کیا جاتا تو اس کی نوعیت کی ساری تاثیر جاتی رہتی۔ دعائیہ اسلوب ہمیں بتاتا ہے کہ ہر راست باز انسان کی جو توحید پرستی کی راہ میں قدم اٹھاتا ہے، صدائے حال کیا ہوتی ہے اور کیا ہونی چاہئے؟ یہ گویا توحید پرستی کے فکر و وجدان کا نچوڑ ہے جو ایک طالب صادق کی زبان پر بے اختیار آجاتا ہے!

۹۔ غضب کے مستحق وہ لوگ ہیں جو تحقیق کے باوجود راہ ہدایت کو چھوڑ دیں اور گمراہ وہ ہیں جو صراط مستقیم کی تلاش نہ کرنا چاہیں۔

***